تعارف وتبصرہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی قرآنی فکر کا مطالعہ

تصنیف: محمد سعود عالم قاسمی

ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سنہ اشاعت: ۱۹۹۴ء، صفحات: ۱۷۸، قیمت: ۶۰ روپے

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تاریخ اسلام کی ان منفرد شخصیات میں سے ہیں جن کے علم وفضل اور خدماتِ جلیلہ سے عہد متاخر کی یہ تاریخ منور ہے اور صرف اسی حد تک نہیں کہ انھوں نے صرف اپنے عہد اور اپنے قرن کو اپنی علمی خدمات سے روشن کیا بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات کے آفاقی کردار کو بعد کی نسلوں کے لئے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی آفاقیت اہل نظر کے سامنے ایک منطقی شکل میں واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔ یوں تو شاہ صاحب کی علمی خدمات کا دائرہ انتہائی وسیع ہے اور اس میں تمام علوم اسلامی اور علوم معاشرت شامل ہیں لیکن ان کی تمام علمی کاوشوں کا محرک اصلی اور مرکزِ ثقل کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جن کی تعلیمات میں انھوں نے فطرت انسانی اور حیات وکائنات کے اعلیٰ ترین اصولوں کا نہایت وسعت اور گہرائی کے ساتھ ادراک کیا اور ان کو نہایت سلیس اور شگفتہ انداز میں آنے والی نسلوں کے لئے اپنی تحریروں میں منتقل کر دیا ہے۔ احیائے سنت اور تعلیم حدیث کے میدان میں شاہ ولی اللہؒ کی گراں قدر خدمات سے علمی دنیا میں کون واقف نہیں۔ آج برصغیر کے مدارس میں علم حدیث کو جو کلیدی اہمیت حاصل ہے بلاشبہ شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خانوادے کی مساعیٔ مشکورہ سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ تاہم قرآن مجید کے باب میں عام طور پر علمی دنیا میں اس سے زیادہ جاننے والے

خال خال ہی ملتے ہیں کہ قرآن کریم کا ہندوستان میں پہلا فارسی ترجمہ شاہ صاحب نے کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی محض عدم واقفیت کی وجہ سے ہے کیونکہ شاہ صاحبؒ سے پہلے متعدد تراجم قرآن فارسی زبان میں ہو چکے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمہ قرآن "فتح الرحمٰن" کے علاوہ، اصولِ تفسیر میں ان کی مختصر اور جامع کتاب "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" بھی عام طور پر مشہور و متداول ہے۔ لیکن اس سے آگے شاہ صاحب کی خدمات کی اہمیت کو جاننے اور سمجھنے والے بہت کم ہیں۔

مولانا سعود عالم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے اپنی کتاب "شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قرآنی فکر کا مطالعہ" میں نہ صرف شاہ صاحب کی قرآنی خدمات کو سیاق و سباق کی روشنی میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے بلکہ شاہ صاحب کے آفاقی فکر کے قرآنی ماخذ کی نشان دہی بھی بڑی حد تک کر دی ہے۔ ساتھ ہی فاضلانہ تحلیل و تجزیے اور نقد و تبصرے سے شاہ صاحب کے فکری غوامض کی عقدہ کشائی بھی کی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک قیمتی اضافہ ہے اور اس نے ولی اللہی فکر کے قرآنی پہلو پر ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب صرف شاہ ولی اللہؒ کی فکر اور ان کی گوناگوں مساعی کو سمجھنے کے لئے ہی نہیں بلکہ خود قرآن کی تفہیم کے لئے بھی ایک اہم تصنیف ہے۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے شاہ صاحب کے قرآنی فکر کو وسیع ترین تناظر میں پیش کیا ہے اور اس میں اولاً ان تمام فارسی تفاسیر اور تراجم قرآنی کا خاصا مبسوط تعارف کرایا ہے جو شاہ ولی اللہؒ کے سے پہلے ہند اور بیرونِ ہند میں دستیاب یا موجود اور معلوم تھے، اس کاوش سے یہ مشہور عام غلط فہمی دور ہو جاتی ہے کہ شاہ ولی اللہؒ پہلے یا دوسرے شخص ہیں جنھوں نے کلام اللہ کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا ہے (ص ۱۰۷) اسی طرح تحقیقی لحاظ سے مصنف نے بڑی کاوش سے ایک اور تاریخی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے اور وہ یہ کہ اس ترجمۂ قرآن کی اشاعت کی وجہ سے اس عہد کے علماء نے شاہ صاحب کی سخت مخالفت کی یہاں تک کہ ان پر قاتلانہ حملے کئے گئے (ص ۱۰۷۔۱۰۴)۔ تاہم یہاں مضمون میں ایک گونہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے کیونکہ مصنف نے ازالۂ غلط فہمی کے بعد یہ معلوم کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی کہ اس غلط فہمی کے آغاز و اشاعت کے پیچھے کیا اسباب کار فرما تھے اور اس کہانی کو گڑھنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ مصنف

نے اس کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ دیگر اسلامی علوم ـــــ حدیث، فقہ، اصول فقہ، تصوف، کلام، سیرت وغیرہ میں شاہ صاحبؒ کے علمی کارناموں کو اختصار کے ساتھ پیش کر دیا جائے تاکہ شاہ صاحب کی جملہ علمی خصوصیات کا ایک خاکہ سامنے آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کے ان علمی خصائص کو سمجھے بغیر قرآنی علوم میں ان کے طرزِ فکر اور طرزِ استنباط کی خوبیوں اور امتیازات کو پورے طور پر محسوس کرنا مشکل ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ مصنف نے شاہ صاحب کے علوم کے اجمالی تعارف تک اپنے کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ شاہ صاحبؒ کی مجموعی فکر کی امتیازی اور مشترک خصوصیات پر ضروری حد تک بحث کر کے ان کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے مثلاً شاہ صاحبؒ کی ایک ممتاز ترین ترین خصوصیت ان کا تطبیقی فکر ہے جس کے تحت وہ مختلف علمی موضوعات کے ان پہلوؤں پر گہری نظر ڈالتے ہیں جن میں نظریاتی لحاظ سے باہمی تناقض محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً تصوف کے دائرے میں نظریہ وحدت الوجود اور نظریہ وحدت الشہود جن کو عام طور پر آپس میں متناقض سمجھا جاتا ہے اور اسی بنا پر دونوں نظریات کے حامیوں کے درمیان زبردست کش مکش اور اختلاف پایا جاتا ہے۔

تیسری خصوصیت مصنف کا وہ نقد و تبصرہ ہے جو شاید اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے اور جس کے تحت مصنف نے شاہ صاحب کے جملہ علوم اور بالخصوص قرآنی فکر میں گویا از سرِ نو جان ڈال دی ہے اور غور و فکر کا میدان اور بھی وسیع کر دیا ہے چنانچہ یہی وہ میدان بھی ہے جہاں مصنف کے اپنے طرز فکر اور انفرادیت کو ابھرنے کا پورا موقع ملا ہے اور کہیں کہیں اپنے علمی جوش میں بعض ایسی باتیں کہہ گئے ہیں جن میں واضح تضاد کی کیفیت نظر آتی ہے۔ مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب کے متصوفانہ فکر پر نقد کرتے ہوئے مصنف اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شاہ صاحب اصلاً تصوف کے شدید مخالف تھے اور انھوں نے عملی اور علمی تصوف کو صرف حالات کے اقتضا اور بر بنائے مصلحت اختیار کیا تھا (ص ۵۷)، جب کہ اس کے ساتھ ہی اس میدان میں مصنف نے شاہ صاحب کی گیارہ کتابوں اور رسالوں کی فہرست دی ہے نیز اس حقیقت کا ذکر کیا ہے کہ وہ نقشبندیہ سلسلہ سے خصوصیت رکھتے تھے اور بایں ہمہ بقیہ سلاسل طریقت سے بھی توسل رکھتے تھے نیز شریعت کو وہ

تمام تر احسان اور تزکیۂ باطن کے مساوی سمجھتے تھے۔ شاید مصنف نے اس پہلو سے غور نہیں کیا کہ علمی معنی میں اس طرح کی مصلحت کیشی پورے کردار کو داغ دار کر سکتی ہے۔ خوبصورت الفاظ کا ملمع اتار کر اگر یہی بات کہی جائے تو اسے ریاکاری کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ ریا اور نمائش کے لئے ضروری نہیں کہ وہ نمود ذاتی کے لئے ہو، وہ فلاحی بھی ہو سکتی ہے لیکن حقیقت اس کی دکھاوا اور ریا ہی رہے گی۔ یہ ساری کاوش بظاہر مصنف نے اس لئے کی ہے کہ شاہ محدث دہلویؒ کو حقیقی تصوف کے "الزام" سے بچالیں!

اس کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ یہ درحقیقت شاہ ولی اللہ کے تطبیقی فکر کو ہندوستانی مسلمانوں کے علمی اور سیاسی انتشار سے ابھرنے والے ایک وقتی مقتضا کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش ہے اور اس طرح شاہ صاحبؒ کا آفاقی اور اسلامی پہلو حد درجہ محدود اور محض عبوری ہو جاتا ہے۔ ان کے مطابق امام غزالیؒ نے تو یہ تطبیق محض شریعت اور طریقت کے درمیان ہی کی تھی لیکن شاہ ولی اللہؒ نے اس کو تمام علوم اسلامی تک وسیع کر دیا (ص ۸۲-۱۸۱)۔ یہاں اول تو یہ علمی اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ صرف وقتی مقتضا کے تحت تھا تو اس کا کیا مطلب ہوگا کہ خود مصنف کے بقول امام غزالیؒ کے تطبیقی عمل کی طرح شاہ صاحب کے یہاں یہ عمل تمام علوم اسلامی تک وسیع ہو گیا؟ اس باب میں بحث کی کمی کھٹکتی ہے۔ اسلامی اور قرآنی حدود میں علمی مسائل اور عملی معاملات میں تطبیق ہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعہ علمی اور عملی نصب العین کا اتحاد ممکن ہے، اسی لئے شاہ صاحب کے اس تطبیقی فکر کو اگر توحیدی فکر کہا جائے تو بجا ہے۔ بلاشبہ شاہ ولی اللہؒ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے تطبیقی فکر کی آفاقی اور اسلامی اہمیت کو بھرپور طور پر محسوس کیا اور قرآنی، فقہی، کلامی اور متصوفانہ دائروں میں پائے جانے والے اضافی یا ظاہری تناقض کو نظر انداز کر کے حقیقی اتحاد کو اپنے تطبیقی فکر سے ہموار کیا مثلاً وجودی اور شہودی نقطہ نظر کا ظاہری اختلاف یا تضاد ان کے شارحین اور متبعین کی مشرب پسندی اور رموز پروری کی پیداوار زیادہ ہے۔ شاہ صاحب نے ان تمام خارجی عوامل کو نظر انداز کر کے وجودی اور شہودی نظریوں کے مشترک پہلوؤں کو نمایاں کر دیا جس سے تخالف اور تناقض کی ظاہری کیفیت تقریباً ختم ہو گئی۔

شاہ صاحب کا یہ تطبیقی فکر درحقیقت ان کے تمام علمی کارناموں کی جان ہے مثلاً علم کلام

جو تاریخی اعتبار سے بیشتر مسلکی فرقہ واریت کو مستحکم کرنے اور بڑھانے کا ذریعہ بنا تھا، شاہ صاحب کے یہاں بالکل ایک نیا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ نہ صرف عقائد کو ایک منطقی اور اصولی فلسفہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں بلکہ احکام الٰہی اور فرامینِ رسالت کی حکمتوں کو اس طرح کھول کر بیان کرتے ہیں کہ جس سے ایمان میں تازگی اور فکر میں استحکام پیدا ہوتا ہے پھر اسی علم کلام سے وہ تاریخِ معاشرت، اقتصاد اور سیاست میں اس طرح کام لیتے ہیں کہ نہ صرف ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی بلکہ پورے تاریخ اسلام کے عروج و زوال کے منطقی اسباب بہت کچھ نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں شاہ صاحبؒ وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے علم کلام کی اہمیت کو نہ صرف عقائد بلکہ احکام شریعت اور ملی روابط کے نقطۂ نظر سے دیکھا، اس کا محدود فرقہ پسندانہ دائرہ نظر انداز کرکے اسلامی زندگی کے ہر دائرے میں ایک نئی معنویت کے ساتھ اس کو برتا اور محوری عقلیت کو چھوڑ کر آفاقی عقلیت کا راستہ ہموار کیا۔ شاہ صاحبؒ کا یہی وہ آفاقی پہلو اور امتیازی وصف ہے جس کی بنا پر علامہ شبلیؒ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ "شاہ صاحب کے زمانے میں علم کلام کا جو سرمایہ موجود تھا وہ صرف اشاعرہ کی تصنیفات تھیں لیکن ان کی ایجاد پسند طبیعت پر ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ انھوں نے علم کلام کے مسائل بالکل نئے اصول کے مطابق ترتیب دئے۔" (ص ۷۰)

اسی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ہمہ گیری توازن، اعتدال، انصاف اور توحیدی فکر کو بھرپور طور پر نمایاں ہونے کا موقع فراہم ہوا اور ان کی نظر ہمیشہ معیشت، معاشرت سیاست، تاریخ، فقہ، کلام و تصوف وغیرہ میں مسلک اور مشرب کی تنگنائے سے نکل کر قرآنی فکر کی وسعتوں کا رخ کرتی ہے۔ شاہ صاحبؒ کی ایک غیر معمولی خصوصیت یہ بھی ہے کہ تطبیق کی علمی اور عقلی صورت گری کے دوران عملی پہلو کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے مثلاً ناسخ و منسوخ آیات کی بحث میں شاہ صاحبؒ نے صرف پانچ آیات میں نسخ تسلیم کیا ہے جب کہ علامہ سیوطیؒ نے بیس آیات اور بعض کے ہاں پانچ سو تک یہ تعداد پہنچتی ہے۔ اس پر مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا تبصرہ بہت معنی خیز بھی ہے اور شاہ صاحبؒ کی عملی بصیرت کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ "جس شخص نے ان پندرہ آیات کی تطبیق غور سے پڑھی ہے وہ باقی پانچ آیات میں بھی بڑی آسانی سے تطبیق دے سکتا ہے، شاہ صاحب کا اصل مقصود تو یہی ہے کہ قرآن مجید میں کوئی آیت سرے سے منسوخ نہیں ہے مگر وہ اس

بات کو مصلحت کی وجہ سے صراحتاً نہیں کہتے کیونکہ اس طرح ان کی بات معتزلہ کے قول کے مشابہ ہوجاتی اور تمام اہلِ علم اس پر غور کرنا چھوڑ دیتے۔" (ص ۸۸)

چوتھے باب میں مصنف نے شاہ صاحبؒ کی قرآنی علوم پر تصانیف کا ایک مختصر تعارف پیش کیا ہے اور یہاں مبصرانہ سطح پر ایک اعلیٰ درجے کا علمی تجزیہ بھی پیش کیا اور اس ذیل میں الفوز الکبیر، فتح الخبیر، تاویل الاحادیث، زہراوین اور المقدمہ فی قوانین الترجمۃ پر الگ الگ لکھا ہے۔ تاویل الاحادیث قرآنی واقعات اور معجزات کی تاویل اور توضیح کے لئے لکھی گئی ہے۔ مثلاً جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ حکم الٰہی کے تحت دریا کو پار کرنے کا ارادہ کیا "تو اللہ نے دریا پر ایک طاقتور ہوا مسلط کی جس نے دریا کو دو نیم کردیا" (ص ۹۵)۔ لیکن شاہ صاحب کی اس توجیہ کو مصنف قرآن کے بیانات اور شہادات سے ہم آہنگ نہیں پاتے، کیونکہ قرآن میں ہوا کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں (ص ۹۵) ہے۔ تاہم اس سے یہ تو واضح ہے کہ مصنف کو تاویل معجزات میں فی نفسہٖ کوئی تردد نہیں ہے اور وہ اس کی علمی ضرورت کے قائل ہیں۔ اس صورت میں قرآن کریم میں انفلاق بحر کے ساتھ کسی ہوا کا تذکرہ نہ ہونا شاہ صاحبؒ کی تاویل کو نہ غیر عقلی بناتا ہے اور نہ غیر مرغوب۔ جب کہ خود مصنف کے بقول "شاہ صاحب کے انداز بیان میں بھی معنویت ہے اور ان کے استدلال میں بھی وزن محسوس ہوتا ہے" (مقدمہ ص ۹)۔ کسی بات کی تاویل اور توجیہ میں عناصرِ قدرت کی حدود سے باہر نکلنا ممکن نہیں لہذا دریا کے پھٹ جانے میں اسباب کی حد تک اگر کوئی غیر مرئی چیز مؤثر ہوسکتی ہے تو وہ کوئی طاقت ور ہوا ہی ہوسکتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدد کے لئے دریا کو دو نیم کرنے کے واسطے اس وقت تک مسلط کیا تھا، جب تک وہ دریا کو پار نہ کرلیں۔ چنانچہ ان کے گزرتے ہی وہ طاقت ور ہوا وہاں سے ہٹالی گئی اور دریائی موجوں نے فرعون کے لشکر کو ڈھانک لیا۔ تاہم اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ مصنف نے شاہ صاحب کی علوم قرآن پر تصانیف کا یہ اجمالی تعارف گہرے مطالعے اور معنوی خوبیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے کرایا ہے۔

قرآن کریم بے شمار آیات میں بحر و بر اور انفس و آفاق میں تدبر اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور ظاہر ہے، معجزات بھی انھیں عناصر کی حدود میں رونما ہوتے ہیں۔ اگرچہ علماء محدثین تاویل معجزات کو بیشتر پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھتے اور ایک غیر ضروری تکلف سمجھتے ہیں لیکن

بایں ہمہ متعدد مشاہیر علما، مثلاً امام غزالیؒ، امام رازی وغیرہ نے اس موضوع پر قیمتی تحریریں چھوڑی ہیں، جو یقیناً عوام سے زیادہ خواص کے لئے ہیں ـــــ شاہ ولی اللہؒ نے بھی اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اس لئے کہ وہ بھی کماحقہ اس حقیقت سے غافل نہیں تھے کہ تدبر قرآن کے دوران جو علمی اور عقلی مشکلات پیش آتی ہیں ان میں معجزات کی تاویل اور عقلی توجیہ بھی ایک بڑی علمی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ترجمہ قرآن کے سلسلہ میں ترجمانی سے لے کر اس کی کتابت واشاعت تک کی باریکیوں کا جس طرح خیال رکھا ہے (ص ۱۰۳)۔ اس کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن تھا کہ قرآنی آیات و واقعات کے تدبر کے دوران، شاہ صاحب اس کے علمی اشکالات اور عقلی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے معجزات اور خرق عادت واقعات کو نہایت خوبی اور سادگی کے ساتھ قابلِ فہم بنانے کی کوشش کی ہے، ان کے نزدیک ان میں اسباب و علل کا سلسلہ بالکلیہ ختم نہیں ہوتا بلکہ کسی نہ کسی درجہ میں غور و فکر اور تدبر کے ساتھ ان اسباب و علل کو بھی سمجھا جا سکتا ہے، یعنی یہ ابنیائی معجزات عادت انسانی کے ضمن میں ہی رونما ہوتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ یہ عادت کمزور ہوتی ہے اس کی مثال وہ اس طرح دیتے ہیں کہ ایک طبیب کسی مریض کو دیکھتا ہے تو اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دیتا، کیونکہ وہ اس مرض کو مہلک نہیں سمجھتا، لیکن قضائے الٰہی ظاہر ہوتی ہے اور مریض اسی مرض میں مر جاتا ہے۔ مریض کی یہ موت اللہ کے حکم سے ہوئی مگر بظاہر اس کی موت کا سبب اس کا مرض بنا ہے گو طبیب کی نظر میں بظاہر یہ مرض ایسا نہیں ہے کہ اس سے موت واقع ہو جائے (ص ۹۳-۹۱)۔ شاہ صاحب کے نزدیک قرآن و سنت میں ایسے اشارات اور مضمرات ملتے ہیں جن کے ذریعہ ایک عارف دانش مند انسان اللہ کو پہچان سکتا ہے۔ ان کے نزدیک جب اللہ تعالیٰ تدبیر کے لئے کسی معجزہ کو ظاہر فرماتا ہے تو اسے عادت اور اسباب والے پیرائے میں اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ فیصلہ الٰہی ارضی اسباب کی متابعت میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نارِ نمرود ٹھنڈی ہو گئی اس کی توجیہ میں شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "وہ آگ میں ڈالے گئے اور وہ اللہ کے ایسے بندے تھے جن سے اللہ راضی تھا، چنانچہ اللہ نے ان کو مخلوق کے شر سے بچانے کا ارادہ کیا اور آگ کے مادے پر ہوا کے ذریعہ ایک ٹھنڈی کیفیت نازل

کی گئی۔ یہ ہوا طبقۂ زمہریریہ سے آگ پر آئی جو شدید ٹھنڈک لئے ہوئے تھی اور اس طرح اس نے آگ کی خاصیت کو بدل دیا" حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود پر بھیجے گئے عذاب کی توجیہ کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں "چونکہ قوم ثمود کا مسکن پہاڑ اور جنگل کا علاقہ تھا اس لئے ان کے حق میں مناسب عذاب زلزلہ اور چیخ تھا" (ص ۹۵)

بلاشبہ ایک راسخ العقیدہ مومن کے لئے، ان توجیہات کی نہ ضرورت ہے نہ اہمیت۔ لیکن ہر عہد میں خاص خاص علماء نے ان توجیہات کی علمی ضرورت کا احساس کیا ہے کیونکہ ہر عہد اور ہر معاشرے میں ایسے لوگ بھی ضرور ہوئے ہیں جو دینی امور کو بھی عقل وحکمت کی راہ سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ کمزور ایمان والے ہی ہوں یا اہلِ تشکیک میں سے ہوں۔ علماء میں بھی بہت سوں کا مذاق متعقلانہ ہوتا ہے اور وہ اسباب وعلل کی کارفرمائی کو اللہ تعالیٰ کی آیات و معجزات میں بھی نظر انداز نہیں کرتے، اور قرآن کریم کی دعوت فکر یعنی آیاتِ الٰہی میں تدبر کا بھی یہی منشا ہے۔

کتاب کا چوتھا، پانچواں اور چھٹا باب درحقیقت اس تصنیف کا مقصود اصلی ہے اور شاہ ولی اللہ کے قرآنی فکر کی اور قرآنی خدمات کی براہ راست تفصیلی ترجمانی کرتا ہے اس حصہ میں قرآنی علوم پر شاہ صاحب کی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ پیش کرنے کے بعد شاہ صاحب کے ترجمۂ قرآن یعنی "فتح الرحمٰن" کا تفصیل کے ساتھ تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ مصنف نے نہ صرف اپنی علمی بصیرت کو اپنی تحقیقی کاوش میں ابھرنے کا موقع دیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی "فتح الرحمٰن" کی ظاہری اور معنوی خوبیاں الگ الگ کرکے اس طرح سامنے رکھ دی ہیں کہ کوئی پہلو نگاہ سے اوجھل نہیں رہا۔ خواہ ترجمے اور ترجمانی کی خصوصیات ہوں یا فقہی نکات، موقع کلام کی رعایت ہو یا ذاتی رجحان، شرعی مسائل کا استنباط ہو یا دیگر مفسرین سے اختلاف کے مواقع کسی پہلو کو بھی مصنف نے نظر انداز نہیں کیا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ تشنہ اور ادھورا بھی نہیں چھوڑا ہے تو بجا ہوگا۔

فتح الرحمٰن کے اس تفصیلی مطالعہ میں مصنف نے ایسے پہلوؤں کو بھی اپنی تحقیق میں نمایاں جگہ دی ہے جو کسی اعتبار سے اختیارات کا موضوع بن کر اہمیت حاصل کر گئے ہیں،

مثلاً "غرانیق العلیٰ" کی تحقیق جو سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب کی وجہ سے علمی اور صحافتی حلقوں میں "آزادیٔ رائے" کا علامتی موضوع بنی ہوئی ہے۔ تاہم اگرچہ مصنف نے اس مسئلہ پر بھی نسبتاً تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور شاہ صاحب کے نقطۂ نظر کو واضح کر دیا ہے لیکن ایک عام قاری کے لحاظ سے کچھ پہلو مبہم رہ گئے ہیں۔ یعنی جس تفصیل کے ساتھ اس موضوع روایت کو اور اس کے ضمن میں سورۃ "النجم" سورہ "الحج" اور سورہ "بنی اسرائیل" کی متعلقہ آیات کو پیش کیا گیا ہے، مناسب ہوتا اگر اس روایت کی وضعیت اور کتبِ سیر میں در آنے کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہوتی۔

شاہ صاحب کے اس ترجمۂ قرآن کے تحقیقی مطالعہ میں شاہ صاحب کی انفرادیت کے مخصوص پہلوؤں کو مصنف نے بہت جلی کرکے اور عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے مثلاً ربط آیات اور نظم قرآن کے اخیر میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے ماخذ و مصادر تفصیل سے درج کیے گئے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ اہم اضافہ جس سے عام طور پر اردو کی علمی کتابیں محروم رہ جاتی ہیں، اعلام کا اشاریہ ہے جس سے قاری کو حوالے ڈھونڈنے میں سہولت ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر مصنف نے ایک بہت بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ قرآنی فکر کو جس وسیع ترین تناظر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے سمجھا اور پیش کیا ہے، عہد جدید میں اس کا عین تقاضہ تھا کہ اس کو اسی شرح وبسط اور نقد و تبصرہ کے ساتھ اہلِ علم اور اہلِ نظر علماء اسلام اور علماء اغیار، سب کے سامنے آنا چاہیئے۔ مصنف کو اللہ تعالیٰ اس علمی خدمت کا بہترین اجر عطا فرمائے اور ان کے علم اور عمر میں برکت عطا کرے کہ انھوں نے اس علمی ضرورت کی اہمیت کو پورے طور پر محسوس کیا اور بہترین طور پر پورا کیا۔

(محمد اعظم قاسمی)